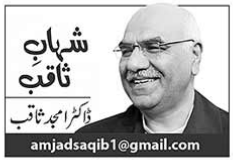

یہ دو کروڑ بچے

میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ میں اس صبح کا منتظر ہوں جو اڑھائی کروڑ بچوں کو سکول جاتا ہوا دیکھے گی۔ معطر، مہربان، جاں فزا۔

''دنیا میں دو سو کے لگ بھگ ممالک ہیں۔ ان میں دس ممالک ایسے ہیں جہاں ان بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے جو سکول نہیں جاتے۔ جن کے ہاتھ میں کاغذ ہے، قلم، نہ کتاب۔ ان دس ممالک میں ایک پاکستان بھی ہے .....سکول سے باہر چھ کروڑ بچوں میں ہر دسواں بچہ پاکستان سے تعلق رکھتا ہے''۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نے یہ بات کہی تو میرے ساتھ بیٹھی ہوئی اطالوی خاتون نے گھوم کے مجھے دیکھا۔ میں چند لمحے پہلے اسے فخر سے بتا رہا تھا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور میرا وطن بے حد عظیم ہے۔ پہاڑ، دریا، وادیاں، صحرا، کوہ و دمن۔ ہم ایٹمی قوت بھی ہیں۔ مجھے لگا جیسے مجھ پہ گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتی ہوئی حیرت مجھے ابھی تک یاد ہے۔

بہت سے لوگوں کے لیے سیکرٹری جنرل کی یہ بات شاید کوئی خبر نہ ہو لیکن جو سوچتے ہیں ان کے لیے ہے۔ سینے میں ایک کسک سی بیدار ہوتی ہے۔ کیا ہم وہی ہیں جنہیں یہ کہا گیا کہ علم کی جستجو کرو خواہ چین جانا پڑے۔ جنہیں سب سے پہلا پیغام ہی پڑھنے کا ملا۔ افسوس اب نہ کوئی گھر سے نکلتا ہے نہ کوئی جستجو کرتا ہے۔

بان کی مون کی تقریر ابھی جاری تھی۔ ''پاکستان میں سکول سے باہر بچوں کی تعداد اڑھائی کروڑ ہے''۔ انھوں نے اپنی بات مکمل کی۔ پاکستانی حکام نے جل کر کہا نہیں یہ دو کروڑ ہیں۔ بلکہ اس سے بھی کم۔ خوش نظری، خوش گمانی، خوش فہمی یا خود فریبی۔ ہاں شاد و آباد بستیوں کا ہم کہہ نہیں سکتے۔ وہاں تو ایک بچہ بھی سکول سے باہر نہیں۔ یہ بدقسمت بچے دور افتادہ دیہات اور پسماندہ بستیوں میں رہتے ہیں۔ تھر کے ریگ زار میں، راجن پور، لورالائی اور کرک میں۔ یہ کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ سائیکلوں کے پنکچر لگاتے ہیں۔ گندگی کے ڈھیر سے کوڑا چنتے ہیں۔ کندھے پہ کپڑا رکھ کر ہوٹل کا میز صاف کرتے ہیں۔ ان کا ایک ہی نام ہے ''چھوٹا''۔ کسی نے کہا انھیں چھوٹا نہ کہو یہ چھوٹے اپنے گھر کے بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے دم قدم سے چولہے جلتے ہیں۔ ٹکڑوں پہ پلنے والے، کونے کھدروں میں جینے والے، بوسیدہ کپڑے پہننے والے۔ جبرِ مسلسل کا شکار یہ چھوٹے۔ اڑھائی کروڑ ہیں یا دو کروڑ۔ اعداد و شمار تو گورکھ دھندا ہیں۔ یہ جتنے بھی ہیں ہمارے قومی وجود کا حصہ ہیں۔ گھر میں ایک شخص بھی ناخوش ہو تو سارے گھر کو سانپ سونگھ جاتا ہے لیکن یہ تب ہوتا ہے جب خوشیاں سانجھی ہوں اور یاد ہو کہ خواب کسی اور کے بھی ہوتے ہیں۔ ہم ایسے کہاں۔ ہم تو کوتاہ فکر ہیں، کوتاہ قامت۔ ہمیں تو یہ بھی یاد نہیں کہ جہالت زہر ہے۔ زہر ہلاہل۔ جس سے ہر تہذیب نے پناہ مانگی، ہر سماج نے الامان کہا۔

''جہالت کی تاریکی صرف علم سے دور ہوتی ہے''۔ اگلے مقرر نے اپنی بات شروع کی۔ علم جو ہر تاریکی کو نور بنا دیتا ہے۔ علم جو انسانیت کا شرف ہے۔ پیغمبروں کی میراث، صوفیوں کا وتیرہ۔ اور لوگ ہیں کہ پھر بھی علم حاصل نہیں کرتے۔ سچ کہا گیا آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، یہ تو دل ہیں جو مردہ ہو جاتے ہیں۔ کانفرنس ختم ہوئی۔ لوگ باہر نکلنے لگے۔ ''مسٹر ثاقب! مجھے یقین ہے کہ ہم دوبارہ ملیں گے تو پاکستان کا نام اس فہرست میں نہیں ہوگا''۔ اطالوی دوشیزہ نے یہ کہا اور مسکرانے لگی۔ لوگ اتنے بھی نامہربان نہیں ہوتے۔ اب کے اسے میری دلبستگی مقصود تھی۔ اس واقعے کو گزرے مدت ہوگئی لیکن نیلی آنکھوں کی وہ حیرت ابھی تک نہیں بھولی۔

یہ اڑھائی کروڑ بچے کب سکول جائیں گے۔ وہ صبح کب طلوع ہوگی جو کسی ٹوٹے پھوٹے گھر پہ دستک دے کر وہاں بیٹھے ہوئے بچے سے کہے گی آؤ میں تمھیں سکول لے جاؤں۔ یہ لو کاغذ، قلم اور کتاب۔ تمھارے گاؤں میں نیا نیا سکول بنا ہے۔ ایک استاد بھی آیا ہے۔ کھیل کا میدان بھی ہے۔ کمپیوٹر بھی ہے جو تمھیں ساری دنیا سے جوڑ دے گا۔ اُٹھو منہ دھولو۔ میں تمھیں لینے آئی ہوں۔ تم تو قدرت کا تحفہ ہو۔ خدا کی سب سے خوبصورت تخلیق۔ تمھارے ہاتھوں میں اوزار اچھے نہیں لگتے۔ یہ سختی اور کھردرا پن۔ ان ہاتھوں کی نرمی کہاں کھو گئی۔ تمھیں منزل تک پہنچنا ہے۔ غربت کی زنجیر بس ٹوٹنے کو ہے۔

یہ اڑھائی کروڑ بچے ..... مجھے ناروے میں ہونے والی اس کانفرنس کی باتیں نہیں بھولتیں۔ نہ ہی ان آنکھوں سے چھلکتی ہوئی حیرت بھولتی ہے۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف کا کہنا ہے کہ جب تک ایک بچہ بھی سکول سے باہر ہے وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ان سے یہی توقع ہے۔ وہ یہ کام کر بھی جائیں گے لیکن یہ صرف پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی ذمہ داری نہیں ہر صوبے کے وزیر اعلیٰ اور ہر اس شخص کی ذمہ داری ہے جو اس وطن سے محبت کرتا ہے۔ وفاقی حکومت، چاروں صوبائی حکومتیں، گلگت بلتستان، آزاد کشمیر، فاٹا اور نیشنل کمیشن برائے انسانی ترقی۔ یہ اڑھائی کروڑ بچے..... میں اس صبح کا منتظر ہوں جو ان بچوں کو سکول جاتا ہوا دیکھے گی۔

میں نے ابھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔